خارجہ تعلقات کے بین الاقوامی مروجہ نظریات کا اسلامی تعلیمات کے تناظر میں جائزہ

*محمد یونس جاوید
**ڈاکٹر شمس العارفین

ABSTRACT

Foreign policy is one of the wheels with which process of international politics operates. It is not separate from the national policy. It is an important tool to relate the relations to other countries. Foreign policies consist of aims and measures that are intended to guide government decisions and actions with regard to external affairs. There are two major classical theoretical traditions in FPA: Realism and Liberalism.

For Realists the main actors on the world stage are states, which are legally sovereign actors. Realists believe that war is the natural condition of world politics. On the other side, Liberals have a different view of world politics, and like Realists, have a long tradition. There are many variants of Liberalism, but the main themes that run through Liberal thought are that human beings are perfectible, that democracy is necessary for that perfectibility to develop, and that ideas matter.

Being a universal religion Islam represents broad vision of its constituted policies and considers itself responsible for the preparation of its rights. In spite of these approaches, Islam gives its own guidance in this perspective. The Holy Prophet(PBUH) practically established the Islamic State, made arrangements of conveying to the whole humanity, the worldly and universal message of Islamic ideology. All facts are evident from the foreign policies of the State of Madina.

Keywords: Foreign Policy, Realism, Liberalism, Anarchy, Power politics, National Interest, Democratic states, Values.

تمہید:

موجودہ دور میں دنیا ایک گلوبل ولیج (Global Village) بن چکی ہے۔ آج جس انداز میں تبدیلیاں اور واقعات رو پذیر ہو رہے ہیں، اسی لحاظ سے مختلف ریاستوں اور اقوام کے مابین پیچیدگیاں، تنازعات اور مختلف معاہدات سامنے آتے رہتے ہیں۔ جس طرح کوئی انسان اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا، اسی طرح کوئی ریاست بھی تنہا نہیں رہ سکتی۔ وہ دیگر ریاستوں اور اقوام سے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ ریاست کی

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

سیاسی، معاشی، دفاعی اور دیگر ضروریات اسے دوسری ریاستوں سے تعاون پر مجبور کرتی ہیں۔ ایک ریاست دیگر ریاستوں اور اقوام سے تعلقات کے قیام میں کچھ بنیادی اصولوں اور مقاصد کو پیشِ نظر رکھتی ہے اور انہیں متعین کرتی ہے۔ اسی بنا پر ہر ملک اور قوم اپنی خارجہ حکمت عملی (Policy) مرتب کرتے ہیں۔ کوئی بھی ریاست اس سے مکتفی نہیں رہ سکتی۔ سائنسی ترقی نے دنیا کے ممالک کو آپس میں مربوط کر دیا ہے۔ اس لیے کوئی ریاست دوسری ریاستوں کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

بین الاقوامی تعلقات میں خارجہ حکمت عملی ایک اہم آلہ (Tool) کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر ریاست کے مفادات اور مقاصد علیحدہ نوعیت کے ہوتے ہیں جن کا تعین اس ریاست کے جغرافیائی، تاریخی، مذہبی، ثقافتی، معاشی اور نظریاتی عوامل کرتے ہیں۔ خارجہ حکمت عملی کے مفہوم کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ریاستیں اپنے مخصوص حالات میں اپنے قومی مفادات اور مقاصد کے حصول کے لیے دیگر ریاستوں سے تعلقات قائم کرنے کے لیے جو طرزِ عمل اور رویہ اختیار کرتی ہیں، انہیں ریاست کی خارجہ حکمت عملی کہا جاتا ہے۔

عالمی تعلقات بنیادی طور پر تاریخ کی پیداوار ہیں۔ یہ انسانی تہذیب سے جڑے ہوئے ہیں۔ قدیم دور میں عالمی تعلقات جنگ اور سفارت کاری پر ہی مبنی ہوتے تھے۔ آج کے دور میں ان کی جہت بدل گئی ہے۔ یہ خارجہ حکمت عملیوں اور اقوام اور ریاست کے مابین سیاسی لائحہ عمل کو اجاگر کرتے ہیں۔ سفارت کاری، عالمی قانون اور اقوام متحدہ کے قیام کے بعد کے مراحل میں اس میں جدت اور تنوع پیدا ہوا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات سے منسلک عالمی مسائل کے ادراک اور ان پر تحقیق و تجسس کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے خارجہ حکمت عملی کے مختلف نظریات اور مکتبہ ہائے فکر اجاگر ہوتے رہے ہیں۔ اہلِ مغرب کے ہاں خارجہ حکمت عملی کے ضمن میں دو مکتبہ ہائے فکر اہم رہے ہیں۔ ذیل میں ان مکاتب فکر کے نظریات کا جائزہ اسلامی تعلیمات کے تناظر میں لیا جاتا ہے۔

ا۔ حقیقت پسندی (Realism)

حقیقت پسندی بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ امور میں ایک اہم نظریہ ہے جس کی بنیادیں قدیم یونانی فلسفہ میں ملتی ہیں۔ یہ مکتبہ فکر حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے بین الریاستی تعلقات میں لائحہ عمل اختیار کرتا ہے۔ حقیقت پسندی کے اہم مفروضات جن پر اس مکتبہ فکر کی بنیاد ہے، درج ذیل ہیں:۔

نراج اور حصول طاقت (Anarchy and struggle for Power)

حقیقت پسند ماہرین اس نظریے کے روایتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ماضی سے چلا آرہا ہے۔اس سلسلہ میں قدیم یونان کے ایک سیاسی نظریہ ساز تھیوسی ڈائی ڈس(Thucydides) کی کتاب " Peloponnesian The War" کا ذکر کرتے ہیں جو کہ اس دور میں ایتھنز اور اسپارٹا کی باہمی جنگوں پر لکھی گئی تھی۔ یہ اس وقت کی اہم شہری ریاستیں تھیں جن کے مابین طاقتی توازن برقرار نہ رہ سکا تھا۔ بدقسمتی سے یہ آپس میں جنگ وجدل کا شکار رہتی تھیں۔ اپنے مشاہدے سے یہ مفکر لکھتا ہے کہ ایتھنز کی ریاست کی حکمت عملی توسیع پسندی پر مبنی تھی جبکہ اسپارٹا کی ریاست اپنے قومی مفادات کے تحت اس توسیع پسندی سے بچاؤ اور تحفظ کے لیے سرگرم کار تھی۔[۱] اس مقصد کے لیے طاقت کا حصول اور اس کا استعمال ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔اس لیے طاقت کے حصول کی نہ ختم ہونے والی جدوجہد جاری رہتی تھی۔

"عالمی سیاست طاقت کے حصول کی ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد ہے جو اپنی جڑیں انسانی فطرت، انصاف، قانون اور معاشرے پر رکھتی ہے یا نہیں رکھتی یا حد بندی کرتی ہے۔"[۲]

کلاسیکل حقیقت پسندی کا دوسرا اہم مفکر نکولو میکاولی (Nicolo Machiavelli) ہے جو سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں پیدا ہوا۔ یہ دور حقیقت پسند مکتبہ فکر کی نشوونما کے لیے بڑا زرخیز تصور کیا جاتا ہے۔ ریاستی مرکزیت کی حقیقت پروان چڑھ رہی تھی۔ میکاولی نے ۱۵۳۲ء میں اپنی کتاب "The Prince" میں اپنی سیاسی فکر اور خیالات کا اظہار واضح انداز میں کیا۔

حقیقت پسند یہ یقین رکھتے ہیں کہ عالمی نظام نراجی کیفیت کا حامل ہے۔ چونکہ دنیا میں کوئی مرکزی حکومت نہیں ہے اسی لیے عالمی سیاست ،ریاستوں کے مابین حصولِ طاقت کی کوشش اور جدوجہد کا نام ہے۔ نراج (Anarchy) حقیقت پسندی کا ایک اہم تصور ہے جسے تمام حقیقت پسند ماہرین نے بیان کیا ہے۔ Jack Donnelly اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "نراج کی اصطلاح ہمارے ہاں یونان سے آئی ہے۔ علمی لحاظ سے اس کا مطلب حکومت یا قانون کی عدم موجودگی، آرک تھیوسی ڈائیڈس کی استعمال کردہ اصطلاح ہے جو ایتھنز کی حکومت کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک شہر کا دوسرے شہر پر حکمرانی کرنا۔ فرق کے لحاظ سے اتحادوں کی رسمی برابری اور برابر والوں کے مابین پہلے حکمرانی کی قیادت دونوں شامل ہیں۔"[۳]

عالمی سیاست میں نراج (بے حکومتی) اسی وجہ سے پایا جاتا ہے کیونکہ کسی عالمی حکومت کا نظم موجود نہیں ہے۔ کوئی مرکزی حکومت نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی ریاست یا ریاستوں کا اتحاد عالمی نظام کو مکمل طور پر کنٹرول کر پاتا ہے۔ تھامس ہوبز پہلا جدید سیاسی مفکر ہے جس نے عالمی تعلقات کو نراجی صورت میں بیان کیا ہے۔ فطری ریاست کا نظریہ بیان کرتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ افراد اپنی سلامتی و بقا کے لیے سختیاں اور بدحالی برداشت کرتے ہیں۔ اپنے اوپر حملہ کی صورت میں افراد اپنی مکمل حفاظت کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ ان حالات میں وہ کیسے مضبوط اور طاقتور بن سکتے ہیں۔ اس نراجی کیفیت میں فطری آزادی کے لیے افراد کے مفادات ترک کر دیے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر نراج اور جنگ میں قریبی تعلق ہوتا ہے۔[۴] تحفظ و بقا ایک ریاست کی بنیادی شناخت ہے۔ اس کے بغیر ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ حقیقت پسند ریاست کے تحفظ و بقا کے لیے طاقت کے حصول کو اولین ضرورت تصور کرتے ہیں۔

طاقت سیاست کا بنیادی پہلو ہے۔ انسانی معاملات ہمیشہ طاقت کے تفاوت کی وجہ سے دو طرح سے نمایاں ہوتے ہیں۔ سماجی اثر اندازی یا کنٹرول اور وسائل کی بنا پر۔[۵] چونکہ طاقت کے حصول سے انسان کو تسکین اور غلبہ حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ افرادی سطح پر تنازعہ کا باعث بنتی ہے۔

> ''حقیقت پسند دعویٰ کرتے ہیں کہ نراجی کیفیت میں ریاستیں طاقت اور تحفظ کے لیے دیگر ریاستوں سے مقابلہ کرتی ہیں۔ مقابلہ کی حالت زیرو جمع کی اصطلاح میں دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ایک عامل کے لیے زیادہ کا مطلب دوسروں کے لیے کم کا ہے۔''[۶]

کوٹلیہ اور میکاولی سے متاثر ہوتے ہوئے بیسویں صدی کے ممتاز حقیقت پسند جارج کینن اور ہینز مارگینتھو بیان کرتے ہیں کہ طاقت کے متعلق سچائی یہ ہے کہ یہ تمام عالمی تعلقات کا بنیادی نقطہ ہے۔ اسی لیے حقیقت پسند بیان کرتے ہیں کہ اقوام کے مابین مقابلہ اور جھگڑا کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ قومی مفاد بھی خارجہ حکمت عملی میں قومی ریاست کی رہنمائی کرتا ہے۔ ٹکراؤ کا موجود ہونا عالمی تعلقات کی حقیقت ہے اور حقیقت پسند اسے طاقت کے لیے لاٹھی سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی لیے قومی مفاد طاقت کی حالت میں بیان کیا جانا عالمی تعلقات کی واحد حقیقت ہے۔ حقیقت پسند اسے معانی کے ساتھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک قومی مفاد اخیر ہے اور یہ ضروری ہے کہ اسے ہر قیمت پر فروغ دیا جائے۔[۷]

حقیقت پسندوں کے مطابق انسانی فطرت تنازعات کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے وہ جنگوں کا ذمہ دار اسے ہی گردانتے ہیں:۔

''حقیقت پسندی انسانوں کی غمگین حالت پر مثالی طور پر اعتماد کرتی ہے جو انسانی فطرت کے غیر تغیر پذیر تنازع کی طرف مائل کرتے ہوئے فرضیہ اخذ کرتا ہے۔''(۸)

گویا طاقت اور طاقت کا حصول حقیقت پسندوں کے نزدیک بنیادی مفروضہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حصول طاقت کے اس بے مہار جذبے نے انسانیت کو کس قدر نقصان سے دوچار کیا ہے۔ اسی انانیت کی بنا پر بیسویں صدی میں دو عظیم عالم گیر جنگیں لڑی گئیں جن کے نتیجہ میں کرہ ارض کا امن وامان غارت ہوا۔ کروڑوں افراد ان کا لقمہ اجل بنے۔ مالی نقصان الگ سے ہوا اور ان کے ہولناک اثرات برسوں پھیلے رہے۔

اسلام زندگی کی ہمہ پہلو تربیت اور تہذیب کے لیے اساسی اصول اور رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کے تعلقات دیگر ممالک، اقوام اور بین الاقوامی طور پر کن اصولوں پر مبنی ہونے چاہییں؟ کن بنیادوں پر اس کے تعلقات استوار ہوں؟ وہ ان سوالات کا سیر حاصل جواب فراہم کرتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی تعمیر اخلاقی اصول وضوابط پر کرتا ہے اور فتنہ وفساد کے تمام راستے مسدود کر دیتا ہے۔ انہی کی روشنی میں یہ حمایت وعداوت کا تعین کرتا ہے۔ اسلامی نصوص کے مطالعہ سے ہمیں کچھ ایسی اقدار حاصل ہوتی ہیں جو مسلم رجحان اور اندازِ فکر کے نقوش متعین کرتی ہیں اور مسلم شعور اور حکمت عملی پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ جس کے تحت انہوں نے بشمول خارجہ تعلقات، زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کے عمل کے لیے کچھ طے شدہ اور تغیر ناآشنا طریقے مقرر کیے ہیں۔(۹)

انسانی جان کا احترام جس قدر اسلام نے کیا ہے اس کی مثال کسی اور دین ومذہب میں نہیں ملتی۔ مقاصد شریعت میں انسانی بقا اور تحفظ جان کو اولیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کو بھی اولین جنگی احکام اس وقت دیے گئے جب ان کی زندگی اور بقاء داؤ پر لگ گئی تھی۔ مسلمانوں کی ابتدائی جنگیں دفاعی نوعیت کی تھیں جیسا کہ غزوہ بدر، احد اور خندق وغیرہ۔ مسلمانوں نے ان جنگوں میں اپنی بقا اور تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے دفاعی اقدام کیا۔ اسلام کا مقصدِ جنگ توسیع پسندی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی فرد کی ذاتی خواہش کے لیے ہوتی ہے۔ اسلام امن وآشتی کا دین ہے۔ اس نے انسانی جان کی حرمت کو بڑا مقدم اور محترم قرار دیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

''جو کوئی کسی کی جان لے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔ اور جس نے کسی کی جان بچائی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔''(۱۰)

حدیث میں دشمن سے جنگ نہ کرنے کا ذکر آیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دفاعی اقدام کے علاوہ صورتوں پر غور کر کے ہی جنگ کا ڈول ڈالا جانا چاہیے:۔

''دشمن سے مڈ بھیڑ کی خواہش نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگتے رہو، پس جب میدان جنگ میں تمہارا سامنا ہو تو صبر کرو۔''(۱۱)

اسلام استعماریت کی خاطر انسانی خون بہانے کے سخت خلاف ہے جیسا کہ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ کئی طاقتور ممالک نے اپنے ادوار میں کمزور ممالک اور اقوام پر ملک گیری اور انانیت کی ہوس میں جارحیت کی جیسا کہ جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی نے استعمار اور حصول اقتدار کی خاطر دنیا کو جنگ کے مہیب شعلوں میں پھینک دیا۔ اس کے برعکس اسوہ حسنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ہمیشہ جنگ و جدل سے بچاؤ کا راستہ چنا اور حتی الوسع کوشش کی کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسلام کے مقاصدِ جنگ میں یہ شامل نہیں ہے کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد یا پوری فوج کو ہی ختم کر دیا جائے۔ اصل غرض اور مقصد یہ ہے کہ دشمن کی قوت کا زور ٹوٹ جائے اور وہ آئندہ سے مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے خلاف کسی قسم کے جارحانہ اقدام سے باز آجائے۔ اس نے جنگ کو ناگزیر حالات میں جائز قرار دیا ہے۔ زیادہ تر جنگوں کی اجازت دفاع اور تحفظ دین کے لیے دی گئی ہے۔ بار بار نقضِ عہد کرنا اور زمین میں فتنہ وفساد پیدا کرنا بھی جنگ کے ذریعے انسداد پاتا ہے۔ اسی طرح مظلوم افراد کی جائز حدود میں حمایت و نصرت کرنے کے بھی احکامات دیے گئے ہیں۔ قوت کا حصول بھی اسی مقصد کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے:۔

''اور تم لوگوں جہاں تک بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کرو۔''(۱۲)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا قانونِ جنگ انسانیت کے لیے زندگی اور امن و سلامتی کا باعث ہے نہ کہ انسانیت کی تباہی و بربادی کی وجہ ہے جیسا کہ دیگر مذاہب۔ تاریخ عالم میں جب بھی جنگیں لڑی گئیں ہیں تو بغیر کسی ضابطہ کی قیود اور اخلاقی حدود سے لڑی گئیں ہیں جنہوں نے کرہ ارض پر ہولناک مسائل کو جنم دیا ہے۔ بریگیڈیئر گلزار احمد لکھتے ہیں کہ لاتعداد جنگوں کے تجربہ سے یہ سبق حاصل ہو جانا چاہیے تھا کہ بے مقصد جنگ صرف تباہی و بربادی لاتی ہے۔ انسانی نسل کے مفاد کا یہ تقاضا تھا کہ بعد از جنگ امن و خوش حالی کا ایک طویل دور موجود ہو جو زخموں کا مداوا کر سکے لیکن اس کے باوجود اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے کئی فاتح اقوام کو انسانی سروں کے مینار اور ملبہ و تباہی کے ڈھیر دکھانے کے علاوہ اپنی خوش حالی اور بلند مقام سے محرومی کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ تلخ تجربہ ان حالات میں ہوا ہے جہاں قوموں نے ایسے نظریہ حیات سے چشم پوشی برتی ہے جس میں جنگ سے متعلق احکام الٰہی موجود تھے۔ (۱۳)

قومی مفاد (National Interest)

موجودہ دور میں بین الاقوامی تعلقات میں قومی مفادات کا تحفظ ایک ٹھوس حقیقت ہے جس پر کسی بھی ملک کی خارجہ حکمت عملی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ ریاستیں بالعموم اسی کے حصول کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ آج مغرب اور اہل مغرب کا شمار ترقی یافتہ اور مہذب دنیا میں ہوتا ہے۔ مغرب میں ریاستوں کی خارجہ حکمت عملی کی بنیادوں میں قومی مفاد(National Interest)، قومیت پرستی(Nationalism)اور طاقتی سیاست (Power Politics) جیسے عوامل پائے جاتے ہیں۔

عالمی تعلقات میں قومی مفاد کا تحفظ اور اس کا حصول ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا اور اسی پر کسی بھی ریاست کی خارجہ حکمت عملی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں ریاستیں بالعموم اسی کے لیے اپنی کاوشیں اور جدوجہد کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی لیے ہر قوم کا رویہ اس کی خارجہ حکمتِ عملی کے تابع ہوتا ہے۔

قومی مفادات کے حصول کے لیے ریاستوں کا کردار اس نظریے میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں ریاستیں اپنے تمام وسائل اور ذرائع استعمال کرتی ہیں۔ قومی مفاد بھی قومی ریاست کی خارجہ حکمت عملی کی رہنمائی کرتا ہے۔ تصادم کو سہارنا عالمی تعلقات کی حقیقت ہے اور حقیقت پسند اسے طاقت کے لیے معاملہ کی چھان بین سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی لیے قومی مفاد کو طاقت کی صورت میں واضح کیا جاتا ہے۔ ان کے مطابق یہی عالمی تعلقات کی اصل حقیقت ہے۔ حقیقت پسندوں کے لیے قومی مفاد ہی انتہا ہے اور اس کو ہر قیمت پر تقویت دینا ایک ضرورت ہے۔[۱۴] ڈاکٹر محمد سرور اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"حصول طاقت کے پس پشت قومی مفادات کا حصول محرک ہوتا ہے جو ان کے نزدیک ایک فطری بات ہے۔ اس میں اخلاقیات یا قانون کی بالادستی کا عمل دخل نہیں۔"[۱۵]

اس مقصد کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:۔

> "حقیقت پسندوں کے مطابق ایسی ریاستوں کا مسلسل مقابلہ جن کی خارجہ حکمت عملی ان کے قومی مفاد کے مطابق ہوتی ہے، عالمی نظام کا ایک مستقل عنصر ہے۔"[۱۶]

قومی مفاد کے حصول کے لیے ریاستی طاقت اور برتری ایک اہم ذریعہ متصور ہوتا ہے۔ اسی کی بنا پر ریاستیں اپنے مفادات کا تحفظ اور ان کا حصول یقینی بناتی ہیں۔ ریاستی برتری کے بارے میں ایک اہم حقیقت پسند Kenneth Waltz لکھتا ہے:۔

''ریاست کی ترجیحات متعین ہوتی ہیں۔ زیادہ تر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ریاستیں کم از کم اپنی سلامتی وتحفظ اور زیادہ سے زیادہ عالمگیر عزم و ارادہ کی جستجو میں رہتی ہیں۔''(۱۷)

طاقت یا قومی مفاد جیسی اصطلاحات کا استعمال کئی توضیحات کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اسی حوالے سے مارگینتھو اپنے تیسرے عمومی اصول میں لکھتا ہے:۔

''مفاد کا نظریہ حقیقت میں سیاست کا جوہر ہے اور وقت اور جگہ کے حالات وواقعات سے متاثر نہیں ہوتا۔۔۔ درآں حالانکہ مفاد کی قسم تاریخ کے ایک خاص وقت میں سیاسی عمل پر منحصر ہوتی ہے، سیاسی اور ثقافتی سیاق وسباق پر انحصار کرتی ہے جس پر خارجہ حکمت عملی تشکیل پاتی ہے۔ بالکل یہی مشاہدہ طاقت کے تصور پر استعمال ہوتا ہے۔''(۱۸)

قومی مفاد کے حصول کے لیے اہل مغرب نے جس طرح کے حربے اور ہتھکنڈے تاریخ عالم میں استعمال کیے ہیں، وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ جرمنی میں ہٹلر نے اور اٹلی میں مسولینی نے توسیع پسندانہ عزائم پر مبنی خارجہ حکمت عملی اور لائحہ عمل اختیار کیا۔ سرد جنگ کے دوران امریکہ اور یورپی ممالک نے اشتراکیت کے خلاف محاذ آرائی کی خارجہ حکمت عملی استوار کی۔ جبکہ روس اور اس کے اتحادی ممالک نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جتھہ بندی کی۔ اسی طرح ہندوستان نے ۱۹۶۲ء میں چین کے جنگی حملہ کو جواز بنا کر خارجہ حکمت عملی کے بل بوتے پر امریکہ سے دفاعی سازوسامان حاصل کیا۔ عراق اور افغانستان پر امریکہ کی چڑھائی کلی طور پر اس کے اپنے مفاد اور مقاصد کے حصول کے لیے تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقوام اور سیاسی قائدین کے فیصلے ہمیشہ قومی مفاد کے پیش نظر کیے جاتے ہیں اور یہ عدل وانصاف کے اصولوں پر بھی پورا نہیں اترتے ہیں۔

طاقت پر مبنی اقدامات عالمی سیاست میں ایک اہم طریقہ واردات رہا ہے۔ عالمی امن اور سلامتی کے قیام کی ناگزیری کے باعث اب جنگ اور اس سے متعلقہ حربوں کی بجائے دیگر حربے دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے کئی طریقے مستعمل ہیں مثلاً عدم تعاون، اقتصادی پابندیاں، سفارتی تعلقات منقطع کرنا، میڈیا کے ذریعہ مخالفانہ پراپیگنڈا کرنا، ناکہ بندی کرنا، فضائی حدود کا استعمال ممنوع قرار دینا، ریاست کا بائیکاٹ کرنا وغیرہ، یہ اور اس جیسے دیگر اقدامات اگرچہ پرتشدد نہیں ہیں لیکن دوسری ریاستوں کو نقصان پہنچانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔ اسلامی تعلیمات اس قسم کے اقدامات کی قطعاً اجازت نہیں دیتیں کہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے دوسروں کو روند ڈالا جائے یا انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

''اے ایمان والو! حق پر قائم رہو اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے خواہ تمہارے اپنے خلاف ہو یا والدین کے خلاف یا رشتہ داروں کے خلاف، کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔ پس تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ عدل سے ہٹ جاؤ۔''(۱۹)

نبی اکرم ﷺ کے اسوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ حق اور نیکی کی حمایت اور تعریف کی جبکہ ظلم اور زیادتی کو ہمیشہ ناپسندیدہ قرار دیا۔ یہ آپ ﷺ کی خارجہ حکمت عملی کا بھی ایک اہم اور بنیادی اصول تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:۔

"انصر اخاک ظالما او مظلوما"(اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم)

صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کی مدد کیسے کی جائے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"تاخذہ فوق یدیہ"(۲۰)(اس کا ہاتھ تھام لو۔)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کو دیگر اقوام اور ریاستوں سے تعلقات خارجہ میں ان کی بھلائی اور خیر خواہی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تعاون علی الخیر کے ضمن میں اسلام مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں سے بھی تعلقات اور تعاون میں کوئی روک نہیں لگاتا۔ اگر یہ قیام عدل اور تعاون علی الخیر کی بنیاد پر ہو تو اس کا حکم دیتا ہے۔ وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:۔

''اسلام میں اسلامی ریاست کے قیام میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا کسی اور دین کے پیروکار ہوں کا تعاون لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور تعاون کی بنیاد مشترکہ بھلائی، دفاع مصالح عامہ اور قیام عدل، امن کا پرچار اور خونریزی کے تدارک پر ہونی چاہیے۔''(۲۱)

اخلاقی اقدار (Ethical Values)

اس مکتبہ فکر میں بین الریاستی تعلقات میں اخلاقیات کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ عالمی تعلقات میں اخلاقیات کو سرے سے اہمیت کے قابل ہی نہیں گردانا جاتا جبکہ داخلی لحاظ سے یہ ریاست اور افراد کا ذاتی فعل تصور کیا جاتا ہے۔ Jack Donnelly اس بارے میں لکھتا ہے:۔

"In popular and foreign policy discussions, 'realist' most frequently refers to arguments against pursuing moral objectives in international relations."(۲۲)

(مقبول اور خارجہ حکمت عملی کی ابحاث میں 'حقیقت پسند' سب سے زیادہ حوالہ دیتے ہوئے عالمی تعلقات میں اخلاقی مقاصد کی پیروی کے خلاف دلائل دیتے ہیں۔)

عالمی تعلقات میں ریاستوں کے قومی مفادات میں اخلاقیات کے اصولوں کو پس پشت ڈالا جائے گا تو انسانیت بدامنی اور انتشار کا شکار ہو ہو جائے گی۔ایسی صورت میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہی پیش آئے گا۔دراں حالیکہ ایسا ممکن نہیں ہے۔اخلاقیات کے اصول ہی انسانیت کے لیے پائدار امن، تحفظ اور سلامتی کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن وسنت کی تعلیمات سراسر اخلاقی اقدار کو ہی نفسِ انسانی اور اقوام وملل کے مابین پروان چڑھانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ قرآن کریم میں امت مسلمہ کا فریضہ یوں بیان کیا گیا ہے:۔

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔''(۲۳)

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور فحاشی، برائی اور ظلم وتعدی سے منع کرتا ہے۔''(۲۴)

اخلاقیات کا وجود ہر دور میں رہا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اہل مغرب اسے اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھاتے رہے ہیں۔اس کے بغیر کسی معاشرہ کی بنیادیں نہ ہی مستحکم ہو سکتی ہیں اور نہ ہی وہ اپنی ہیئت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔خوراک کا قحط فرداً فرداً لوگوں کی جان لیتا ہے جبکہ اخلاقیات کا قحط معاشروں، قوموں اور تہذیبوں کو آناً فاناً تباہ کر دیتا ہے۔ تمام الہامی ادیان میں اس بارے میں واضح احکامات ملتے ہیں۔

آزاد خیالی (Liberalism)

خارجہ تعلقات میں آزاد خیالی ایک اہم نظریہ ہے جو جنگ عظیم دوم کے بعد بڑی تیزی سے عالمی تعلقات کے باب میں ارتقائی مراحل طے کرتا گیا۔ یہ بالعموم باہمی انحصار، آزادانہ تجارت، اجتماعی تحفظ، بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کا قیام اور ریاستوں کے مابین مطابقت وہم آہنگی کے نظریات پر مشتمل ہے۔ آزاد خیالی کے ارتقاء میں تحریک تنویر کا کردار بڑا اہم ہے۔اس دور کے مختلف مفکرین نے اس کے تصورات اور نظریات کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ کیرن مگسہب اس بارے میں لکھتا ہے:۔

''آزاد خیالی کا ارتقاء تحریک تنویر کی رجائیت پسندی، انیسویں صدی کی سیاسی اور اقتصادی آزاد خیالی اور بیسویں صدی کے ولسن ازم کی مثالیت پسندی میں ملتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں تحریک تنویر کی شمولیت یونانی خیال کی آزاد خیالی پر موقوف ہے جو کہ افراد کے باشعور ہونے کی دلالت کرتے ہوئے عالمگیر طور پر فطرت اور انسانی معاشرے دونوں پر قوانین کی حکمرانی قائم کرتا ہے۔''(۲۵)

سترھویں صدی عیسوی میں ولندیزی منصف ہیوگو گروشیئس اس مکتب فکر کا ایک اہم مفکر گزرا ہے۔ اس نے مغرب میں سب سے پہلے عالمی قانون پر توضیحات اپنی کتاب"The Rights of War and Peace"میں پیش کیں۔ اس کے مطابق قانون عالمی ریاستوں کے رویہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کی طرح ریاستوں میں عالمی معاشرہ کے اصول وضوابط کارفرما ہوتے ہیں۔ جان لاک نے سب سے پہلے معاشی اور انسانی حقوق کے سلسلہ میں فطری قانون کا تصور پیش کیا۔ اس نے ۱۶۸۸ء میں اپنی کتاب"Two Treaties on Government" لکھی۔ جس میں اس نے فطری قانون(Law of Nature) کو فطری ریاست کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔

اٹھارھویں صدی کا ایک اور مغربی مفکر عمانویل کانٹ (۱۸۰۴ء-۱۷۲۴ء) تھا۔ اس نے نراجی کیفیت کے خاتمے کے لیے ریاستوں کا ایک ایسا وفاق بنانے کا تصور بیان کیا جو اپنی جداگانہ حیثیت میں خود مختار ہو۔ اسی طرح اس کا آفاقی شہریت(Cosmopolitan city) کا نظریہ بھی آزاد خیالی کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کی مشہور کتاب امن عالم کی پائیداری اور دیگر نظریات پر "The Perpetual Peace" ہے۔ آزاد خیالی کے زیادہ تر تصورات اور مفروضات مثالیت پسندی کے افکار سے ملتے جلتے ہیں۔ تاہم بیسویں صدی کے نصف آخر میں اس کے خیالات میں کئی مفکرین نے ترمیم واضافہ کیا اور اس کی ساخت وپرداخت میں نئے لوازمات کو داخل کیا۔

فطری حقوق(Human Rights)

یہ مکتب فکر انسان کے فطری حقوق کا داعی ہے اور انسانی فطرت کو اصلاح کی طرف مائل کرنے کا قائل ہے۔ وہ انسان کی آزاد خیالی اور یکساں حقوق کا نگہبان ہونے کا دعوے دار ہے:۔

''اول، تمام شہری قانونی لحاظ سے تعلیم، آزاد پریس تک رسائی اور مذہبی رواداری کی بنیاد سے برابر ہیں۔ دوم، ریاست کی قانون ساز اسمبلی صرف لوگوں کے اختیار کی ذمہ دار ہے جن

کے بنیادی حقوق کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ سوم، افراد کی آزادی کی ایک اہم قدر ان کا اپنی جائداد رکھنے کا حق ہے۔''(۲۶)

آزاد خیالوں کے اس نظریہ میں تضاد اور بعد پایا جاتا ہے۔ ان کے مطابق ایک طرف تو انسانوں کو فطری حقوق حاصل ہونے چاہییں اور دوسری طرف وہ انسانوں کی آزاد خیالی اور آزاد روی کا بھی قائل ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بات متعین ہونا ضروری ہے کہ انسانوں کے فطری حقوق کیا کیا ہیں اور ان کی حدود کہاں تک ہیں؟ لیکن یہ مکتب فکر اس بات کا کوئی تسلی بخش اور قابل اطمینان جواب دینے سے بالکل قاصر ہے۔ اگر انسانوں کے فطری حقوق سے مراد ان کی معاشرتی اقدار سے مطابقت کو لیا جائے تو وہ بغیر کسی حدود و قیود کی معاشرتی اقدار ہیں جن کی کسی الہامی مذہب میں کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اسلام نے فرد کو جو توقیر بخشی ہے وہ کسی دوسرے مذہب نے انسانیت کو نہیں دی:۔

''اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔''(۲۷)

اسلامی تعلیمات اس بارے میں واضح احکامات بیان کرتی ہیں۔ سورہ انعام کی آیات ۱۵۱ -۱۵۳ میں مختلف اقسام کے احکامات کو ایک ہی جگہ پر بیان کر دیا گیا ہے مثلاً شرک سے اجتناب، والدین کے ساتھ حسن سلوک، غربت و افلاس کے اندیشہ سے اولاد کو قتل کرنا، بے حیائی کے امور، انسانی جان کا تقدس و تحفظ، مال یتیم سے اجتناب، ناپ تول میں دیانت، سچ بولنا، اللہ تعالیٰ سے عہدِ بندگی اور صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین وغیرہ۔

﴿قُلْ تَعَالَوْا۟ أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ۖ أَلَّا تُشْرِكُوا۟ بِهِۦ شَيْـًٔا ۖ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَٰنًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَوْلَٰدَكُم مِّنْ إِمْلَٰقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا۟ ٱلْفَوَٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا۟ ٱلنَّفْسَ ٱلَّتِى حَرَّمَ ٱللَّهُ إِلَّا بِٱلْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿﴾ وَلَا تَقْرَبُوا۟ مَالَ ٱلْيَتِيمِ إِلَّا بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُۥ ۖ وَأَوْفُوا۟ ٱلْكَيْلَ وَٱلْمِيزَانَ بِٱلْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَٱعْدِلُوا۟ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ ٱللَّهِ أَوْفُوا۟ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿﴾ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَٰطِى مُسْتَقِيمًا فَٱتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا۟ ٱلسُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِۦ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾(۲۸)

اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اخلاقی حقوق اور انسانی حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ماسوائے اس کے کہ اخلاقی حقوق کی خلاف ورزی پر حکومت وریاست کوئی اقدام نہیں کرتی ،اس کے لیے روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پرس ہو گی جبکہ بنیادی انسانی حقوق کا اطلاق اور نفاذ اسلامی ریاست کا فریضہ اور دینی ذمہ داری ہے۔ گویا اسلامی نظام حیات میں بنیادی انسانی حقوق کے نفاذاور تحفظ کا فطری اور موثر انتظام وانصرام کیا گیا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہل مغرب انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کو بڑی اہمیت کا حامل گردانتے ہیں لیکن اس معاملہ میں ان کا زاویہ نگاہ اسلام سے بالکل مختلف ہے۔اسلام انسانی حقوق کو فرد کے اللہ تعالیٰ سے عبدیت کے تعلق سے دیکھتاہے جبکہ انسانی حقوق کا مغربی تصور لادینیت پر استوار ہے جو فرد کے بطورِ شہری ریاست سے تعلقات پر مبنی ہے۔ایک طرف تواہل مغرب بنیادی انسانی حقوق کا نعرہ بڑی شدومد سے لگاتے ہیں اور دوسری طرف وہ اس کی سنگین خلاف ورزیوں کا باعث بھی بنتے ہیں۔ دنیا بھر میں جہاں بھی ظلم وستم، استحصال،ناانصافی اور جبر وتشدد کا معاملہ درپیش آتا ہے وہاں پس پردہ یہی قوتیں ہوتی ہیں۔ویاناکانفرنس کے بنیادی انسانی حقوق ڈیکارریشن میں یہ بات بیان کی گئی ہے:۔

''تمام انسانی حقوق آفاقی،ناقابل تقسیم،ایک دوسرے پر منحصر اور ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔''(۲۹)

اقوام عالم کے اس ڈیکلریشن کو ماننے کے باوجود اہل مغرب اس سے تفاوت کرتے ہوئے اپنے شہریوں کے لیے خاص حقوق رکھنے کی بات کرتے ہیں۔جیسا کہ یورپی یونین کے بنیادی حقوق کے چارٹر میں یہ بات بتائی گئی ہے:۔

''کچھ خاص حقوق صرف یورپی یونین کے شہریوں کے لیے ہی مختص ہوں گے۔''(۳۰)

اس طرح ان کے فطری انسانی حقوق کے دعوے کی قلعی مکمل طور پر کھل جاتی ہے۔یعنی ہاتھی کے دانت ،کھانے کے اور دکھانے کے اور۔

جمہوری امن نظریہ (Democratic Peace Theory)

کانٹ کی تحریروں سے جمہوری امن نظریہ کا اظہار ہوتا ہے۔اس کے مطابق جمہوری ریاستیں اور ان کے آئین ریاستوں کے جنگ کے عزائم کو محدود کرتے ہیں۔ایک آزاد خیال ریاستوں کے معاشرے میں جنگ کی کوئی بہتر وجہ نہیں ہوتی کہ وہ دیگر آزاد خیال ریاستوں سے الجھ پڑے۔ Jeffrey W. Meiserاپنے مضمون میں لکھتاہے کہ

جمہوری امن نظریہ آزاد خیال مکتب فکر میں عالمی تعلقات کے نظریہ میں سب سے مضبوط حصہ دار تصور کیا جاتا ہے:۔

> ''یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جمہوری ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ میں الجھنا پسند نہیں کرتیں۔ اس مظہر کی وضاحت کے دو حصے ہیں۔ اول، جمہوری ریاستیں طاقت پر اندرونی پابندیوں کی حامل ہوتی ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ دوم، جمہوریتیں ایک دوسرے کو بطور قانونی اور بے خوفی سے دیکھتی ہیں اور اسی لیے وہ ایک دوسرے کے ساتھ بنسبت غیر جمہوری ریاستوں کے تعاون واشتراک کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہیں۔''(۳۱)

آزاد خیالوں کے مطابق امن ریاست کے تعلقات کی ایک عمومی حالت ہے۔ کانٹ کے الفاظ میں امن دائمی طور پر قائم ہو سکتا ہے۔ فطری قوانین لوگوں کے مابین ہم آہنگی اور باہمی تعاون کے لیے مخصوص ہیں۔ اسی لیے جنگ غیر فطری اور غیر منطقی ہے۔ یہ ایک مصنوعی اختراع ہے اور انسانی فطرت کی کسی خاصیت کی پیداوار نہیں ہے۔(۳۲)

مغربی جمہوریت نے انسان کو جو کچھ ودیعت کیا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ جمہوریت پسندوں نے جس طرح سے انسانیت کو تباہی و بربادی سے دوچار کیا ہے، وہ دو عالم گیر جنگوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ قیام امن کے لیے اسلام نے عدل وانصاف، مساوات، بردباری، رواداری، تکریم انسانیت جیسی خصوصیات کا درس دیا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر انسانیت نہ صرف اپنے بنیادی حقوق کو حاصل کر سکتی ہے بلکہ امن عالم کی پائداری بھی ممکن بنائی جا سکتی ہے۔

عالمی حکومت اور جمہوری ریاستوں کے مابین تعاون واشتراک

اس مکتب فکر کے حامی مفکرین ایک ایسی حکومت کے داعی ہیں جو عالمی طرز کی ہو لیکن اس میں ریاستیں خود مختار حیثیت کی مالک ہوں۔ اس کے لیے وہ عالمی تنظیموں کے مؤثر کردار کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ روایتی مفکرین کانٹ، بینتھم اور Mazzini ایسے عالمی اداروں کے قیام پر زور دیتے ہیں جو ریاستوں کے درمیان غیر یقینی کو کم کرے اور باہمی اعتماد کو پروان چڑھائے۔(۳۳) کانٹ بھی ریاستوں کے وفاق کا حامی ہے۔ اس کے خیال میں ایک ایسی تنظیم کا وجود ضروری ہے جو جنگ کی تباہ کاریوں کو روک سکے اور عالمی امن کے مستقل قیام میں بھرپور مدد فراہم کر سکے۔ اس کے نزدیک اس کے لیے عالمی نراج کی کیفیت کا خاتمہ ضروری ہے:۔

''یورپ کے جنگ سے اکتائے ہوئے لوگ جھوٹ کو جان لیں گے اور جمہوری ریاستوں کے ایک مزید جگ دیسی نظام کا وفاق بنائیں گے جو ان کے درمیان جنگ کا خاتمہ کرے گا۔''(۳۴)

یہ مکتب فکر ریاستوں کے باہمی اشتراک وتعاون کی بھی حمایت کرتا ہے۔ اس کے مطابق ریاستوں کے مابین تعاون ان کی ترقی وخوشحالی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے وہ ان کے درمیان تجارت اور سرمایہ کاری کی بڑی شدومد سے حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جیفری میزر کے نزدیک آزاد خیال قواعد عالمی تعاون واشتراک، حقوق انسانی، جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کی دست گیری کرتے ہیں۔(۳۵)

نراجی کیفیت کے خاتمے کے لیے یہ مکتبہ فکر ادارہ جاتی بنیاد کو اہمیت دیتا ہے۔ ان کے نزدیک عالمی نراج کے لیے بہترین حل ایک عالمی ادارے کا قیام ہے جو امن عالم اور باہمی تعاون واشتراک کو ریاستوں کے درمیان فروغ دے سکے۔ آزادانہ تجارت اور تجارت میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا جدید باہمی انحصار نظریہ کا مغز ہے۔ مثال کے طور پر یورپ میں علاقائی صنعتی پھیلاؤ اس عقیدے سے متاثر تھا کہ ریاستوں کے درمیان تنازع کے احتمال کو ایک جغرافیائی علاقے کے ارکان کے درمیان تجارتی اور صنعتی اشتراک کے مشترکہ مفاد سے کم کیا جاسکتا ہے۔(۳۶) یہ مفکرین ایسی ریاستوں کی ایسی خارجہ حکمت عملیوں کی تشکیل کے حق میں ہیں جو کہ باہمی تعاون واشتراک، بقائے باہمی، آزادانہ تجارت، تنازعات کے پُرامن حل، عالمی اداروں کے قیام اور تنازعات اور جنگوں کی روک تھام کے لیے اس کا مؤثر کردار وغیرہ پر مشتمل ہوں۔

''پچھلے دس سال کے عرصہ میں ایک وسیع بحث اس کشادگی پر ہوئی ہے کہ جمہوری ریاستیں غیر جمہوری ریاستوں سے زیادہ پُرامن ہوتی ہیں اور اس کے پیچھے وجہ ریاستوں کے کردار اور ان کی خارجہ حکمت عملیوں کے مابین فرضی ربط کا ہونا ہے۔''(۳۷)

انور نجیتا لکھتی ہیں کہ جمہوری ممالک کی خارجہ حکمت عملی کے اہداف ایک دوسرے کے ساتھ پرامن تعلقات کو فروغ دینا ہے۔(۳۸)

جمہوری امن نظریہ کے طور پر اس بات اور نظریہ پر یقین رکھتے ہیں کہ جمہوری نظام کے قیام سے دنیا میں امن وامان کا فروغ ممکن ہو سکتا ہے۔ اس لیے جمہوری ریاستوں کے قیام اور ان کے کردار سے یہ خواب پورا ہو سکتا ہے اور جنگ کے خطرات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ جمہوری ریاستوں کے مابین تعاون واشتراک اور باہمی انحصار پر زور دیتے ہیں۔ آزاد تجارت کا نقیب مکتبہ فکر ہے جو معاشی میدان میں تعاون واشتراک کا مظاہرہ کرتا ہے۔

ایک ایسی عالمی تنظیم جو مؤثر طاقت رکھتی ہے، کا قیام ان کی سوچ کا مظہر ہے۔اس کے قیام سے امن کا قیام اور جنگ کا تدارک ہو سکے گا۔اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ عالمی تنظیم ریاستوں کی مقتدرانہ حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے وسائل اور ذرائع سے لائحہ عمل اختیار کرے۔اس ضمن میں تمام ریاستیں اس کے فیصلوں کو تسلیم بھی کریں۔ آزاد خیال ریاستوں کے ساتھ ساتھ غیر ریاستی اداروں، تنظیموں اور کرداروں کے ریاست کے اندرونی کردار اور خارجہ تعلقات کے ضمن میں اہمیت کو مد نظر رکھتے ہیں۔وہ ان سے خارجہ حکمت عملی کے عناصر کے طور پر معاملہ کرنے پر زور دیتے ہیں۔

اسلام دیگر اقوام اور ریاستوں کے ساتھ تعاون اور تعلقات کی بنیاد خیر اور بھلائی کے اصول پر استوار کرتا ہے۔اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے:۔

> ''نیکی اور پرہیز گاری کے معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کی بات میں تعاون نہ کرو۔''(۳۹)

اس آیت میں باہمی اور بین الاقوامی معاملات میں نیکی اور جائز کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور گناہ اور کسی پر ظلم یا زیادتی کرنے میں کسی فرد، ریاست یا قوم سے عدم تعاون کا رویہ اختیار کرنے کا واضح اصول بیان کیا گیا ہے۔

سورہ ممتحنہ میں غیر مخالفین گروہ کے بارے میں "بر" کا حکم دیا گیا ہے۔یہ قرآن کریم کی ایک معروف اور جامع اصطلاح ہے جو معاشرتی لحاظ سے بھلائیوں کا ایسا مکمل نقشہ کھینچتی ہے جس میں رفاہی معاشرہ کے تمام پہلو پائے جاتے ہیں۔سورہ بقرہ میں اس اصطلاح کے بارے میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

> نیکی یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر کو اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔جب عہد کرے تو عہد پورا کرے۔''(۴۰)

معاہدات کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ریاستوں اور اقوام کے مابین باہمی دلچسپی کے مشترک امور پر اتفاق رائے قائم کیا جائے۔اسلامی ریاست کے معاہدات کا اساسی مقصد امن و امان کا قیام، ظلم کا خاتمہ، بنی نوع انسان کی فلاح اور لوگوں کے معاشی، سیاسی اور اجتماعی حقوق کی مساوات ہے۔اسلامی حکومت عالمگیر نوعیت کی ہوتی ہے اور

اس حیثیت سے بین الاقوامی تعلقات کو بروئے کارلاتی ہے لیکن اپنے اصل مقصد سے دستبردار نہیں ہوتی ہے۔[۴۱] خارجہ تعلقات کے قیام میں معاہدات ہمیشہ عقودات افراد کے درمیان تعلقات کا آسان طریقہ کے لحاظ سے طبعی وسیلہ رہے ہیں۔[۴۲] ریاستوں کے درمیان سیاسی و دفاعی نوعیت کے معاہدات انسانی معاشرے کے لیے بہتری اور فلاح کی ضمانت دیتے ہیں۔ اس طرح افراد واقوام اور ریاستیں ایک دوسرے کا حلیف بن کر رہتی ہیں اور کسی فریق کے لیے بد عہدی کرنا آسان نہیں ہوتا۔

خلاصۃ البحث

خارجہ حکمت عملی کے حوالے سے جتنے بھی مکاتب فکر ہیں ،وہ متضاد اور غیر متوازن نظریات کے حامل ہیں۔ حقیقت پسند حصولِ طاقت اور حصولِ مفاد کے علمبردار اور نکتہ رس ہیں۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملیوں میں اخلاقی اقدار اور احترامِ انسانیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جبکہ آزاد خیال عالمی قانون اور نراجی کیفیت کے خاتمے کے لیے عالمی اداروں اور تنظیموں کی افادیت کے قائل ہیں۔ ان مکاتب فکر کے پاس کوئی ایسالائحہ عمل اور نظریہ حیات موجود نہیں ہے جو بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملیوں کے میدان میں اپنی افادیت اور امن پسندی کو ثابت کرسکے۔ اسی لیے دنیا دو عالمگیر جنگوں کا نشانہ بن چکی ہے ۔ اس وقت عالمی طاقتیں جس طرح عالمی اداروں ،پسماندہ ریاستوں اور اقوام کواپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کررہی ہیں،وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ انسانیت سلگتے ہوئے مسائل اور باہمی تنازعات میں گھری ہوئی ہے۔ ان حالات میں بین الاقوامی تعلقات میں ایسی خارجہ حکمت عملی کی ضرورت ہے جو انسانیت کو ان تمام مسائل کے گرداب سے نکال سکے۔

اسلامی تعلیمات نے جہاں زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کی ہے۔اسی طرح اس نے بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملی کے بارے میں بھی واضح احکام اور ہدایات دیں ہیں۔ قرآن وسنت کی نصوص اور فقہی نظائر کے بے بہاذخیرے نے اس کے اصول وضوابط اور راہیں متعین کردی ہیں۔ یہ دنیا کی قدیم ترین تعلیمات ہیں جو اس موضوع کا مکمل احاطہ کرتی ہیں۔ اس سے قبل اس ضمن میں کسی قوم یاریاست کے پاس اس طرح کا مکمل لائحہ عمل اور ہدایات موجود نہ تھیں۔ اسلامی تعلیمات سے یہ واضح اصول بھی نکلتاہے کہ اسلام میں خارجہ تعلقات کی بنیاد امن اور صلح پر ہے،جنگ پر نہیں۔ اسلام نے اس اصول کو مکمل رہنمائی اور احکامات کے ساتھ بیان کیاہے اور اس کی عملی شکل ہمیں ریاست مدینہ کے عکس میں مکمل جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ موجودہ

مثالیت پسندی (Idealism) اور آزاد خیالی (Liberalism) کا بین الاقوامی مکتب فکر جو مغربی مفکرین کی تحریروں اور خیالات سے متشکل ہوا، وہ اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا۔ اگرچہ ان مکاتبِ فکر میں اخلاقی اقدار اور رواداری کو مد نظر رکھا گیا ہے لیکن بین الاقوامی تعلقات میں اس کا پرتو بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جبکہ اس کے برعکس اسلام میں حقیقت پسندی اور مثالیت پسندی کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات اور فقہائے عظام کے اقوال و آراء کے استنباط سے خارجہ حکمت عملی کے درج ذیل رہنما اصول سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ بین الاقوامی تعلقات میں تعاون کی بنیاد نیکی اور تقویٰ کے اصول پر ہونی چاہیے۔

۲۔ ظلم اور گناہ کے معاملات میں عدم تعاون کی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔

۳۔ بین الاقوامی معاہدات کی حتی الوسع پاس داری کرنی چاہیے اور نقضِ عہد سے گریز کا رویہ اپنانا چاہیے۔

۴۔ امن وامان اور صلح جوئی اختیار کرنے میں لیت و لعل سے کام نہیں لینا چاہیے۔

۵۔ عالمی انسانی برادری کے قیام کے لیے کوشش و کاوش جاری رکھنا بھی ذمہ داری کا تقاضا ہے۔

۶۔ مظلوموں اور کمزوروں کی دست گیری کے لیے ہر ممکن اقدام کرنا جو کہ بین الاقوامی حدود اور اصولوں کے مطابق ہو۔

۷۔ بین الاقوامی اصولوں کی پاس داری اور احترام کرنا ضروری امر ہے۔

۸۔ زیادتی کا شکار قوم یا ریاست کے کے لیے اتنی ہی بدلے یا انتقام کی اجازت ہے جتنی کہ زیادتی روا رکھی گئی ہو۔

۹۔ ظلم و زیادتی کے معاملات میں نہ تو کسی ریاست اور قوم کی حمایت کی جائے اور نہ ہی اس ضمن میں حوصلہ افزائی کی جائے۔

۱۰۔ غیر مسلموں سے دوستی رکھتے وقت اسلامی تعلیمات کو مد نظر رکھا جائے۔

۱۱۔ اسلامی ریاست کو یہ روا نہیں کہ وہ ایسی ذمہ داری قبول کرے جسے وہ نبھانے کی نیت نہ رکھتی ہو اور نہ ہی دھوکہ دہی کا رویہ اپنائے۔

۱۲۔ اسلامی ممالک اور ریاستوں کی دولت مشترکہ کے قیام کے لیے اقدامات کرنا بھی خارجہ حکمت عملی کا ایک رہنما اصول ہے۔

۱۳۔ غیر مسلم بڑی طاقتوں کے آپسی تنازعات اور جنگوں میں فریق نہ بنا جائے اور نہ ہی ان کے آلہ کار بن کر کسی مسلم ریاست پر فوج کشی یا حملہ کرنے میں معاونت کی جائے۔

مراجع وحواشی

۱۔ John Baylis and Steve Smith, The Globalization of World Politics: An Introduction to International Relations, (4e) Oxford Press New York, 2008.p.198.

۲۔ Ibid

۳۔ Jack Donnelly, Realism and International Relations, Cambridge University Press London, 2004.p.32

۴۔ Martin Griffiths, Terry o' Callghan and Steven C. Roach, International Relations: The key Concepts, Routledge New York, 2008.p.7

۵۔ Steve Smith, Amelia Hadfield and Tim Dunne, Foreign Policy: Theories, Actors, Cases, Oxford University Press London, p.36

۶۔ The Globalization of World Politics, p.208

۷۔ International Relations, Rai Technology University Bangalore, p.33

۸۔ Davide Orsi, J.R. Avgustin and Max Nurnus, Realism in Practice, E. International Relations Publishing Bristol England, 2018.p.157

۹۔ ابو سلیمان، عبد الحمید احمد، اسلام اور بین الاقوامی تعلقات، منظر اور پس منظر، کلاسیکل پرنٹرس دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۵۴

۱۰۔ المائدہ ۵:۳۲

۱۱۔ الجامع الصحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب: لاتمنو القاء العدو، حدیث رقم: ۳۰۲۵؛ ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب: فی کراهیة تمنی لقاء العدو، حدیث رقم: ۲۶۳۱، دارالسلام لوئر مال لاہور، ۱۴۳۳ھ

۱۲۔ الانفال ۸:۶۰

۱۳۔ گلزار احمد، بریگیڈیر، غزوات رسول اللہ ﷺ، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۶۴

۱۴۔ The Globalization of the World, p.192

۱۵۔ محمد سرور، ڈاکٹر، بین الاقوامی تعلقات اور عالمی سیاست، علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۳۹

۱۶۔ Peter Sutch and Juanita Elias, International Relations THE BASICS, Routledge New York,2007.p.54

۱۷۔ Kenneth Waltz, Theory of International Politics, Addison-Wesley Publishing Company, 1978.p.118

۱۸۔ Hans J. Morgenthau, Politics among Nations The Struggle for Power and Peace, Knopf New York, 1978.p.10-11

۱۹۔ المائدہ ۵:۲

۲۰۔ الجامع الصحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب أعن اخاک ظالما أو مظلوما، حدیث رقم ۲۲۶۴

۲۱۔ وهبہ الزحیلی، الدکتور، الفقة الاسلامی وادلتہ، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، ۲۰۰۰ء، ۸/ ۶۴۱۶

۲۲۔ Karen A Mingst, Essentials of International Relations, W.W. Norton and Company New York, 2003.p.63

۲۳۔ آل عمران ۳:۱۱۰

۲۴۔ النحل ۱۶:۹۰

۲۵۔ Essentials of International Relations, p.63

۲۶۔ The Globalization of World Politics, p.222

۲۷۔ بنی اسرائیل ۱۷:۷۰

۲۸۔ الانعام ۶:۱۵۱۔۱۵۳

۲۹۔ The Vienna Declaration 1993, UN, NY 1995, p.30

۳۰۔ Human Rights in the EU: The Charter of Fundamental Rights, House of Common Library, Research Paper 00/32, 20 March 2000.

۳۱۔ Stephen McGlinchey, Rosie Walters & Christian Scheinpflug, International Relations Theory, E-International Relations Publishing Bristol England, 2017.p.23

۳۲۔ Scott Burchill, Andrew Linklater, Richard Devetak, Jack Donnelly, Theories of International p.58 Relations, Palgrave Macmillan, New York, 2005.

۳۳۔ Los Angeles, 2011.p.1436 International Encyclopedia of Political Science, Sage

۳۴۔ International Relations: The Basics, p.69

۳۵۔ International Relations Theory, p.24

۳۶۔ Ibid,p.64

۳۷۔ The Key Concepts, p.190 International Relations:

۳۸۔ Anuranjita W., Liberalism and Neoliberalism, p.17/https://www.liberalism and neo liberalism_university of delhi/institute of lifelong learning/publications/

۳۹۔ المائدہ ۵:۲

۴۰۔ البقرہ ۲:۱۷۷

۴۱۔ غازی، حامد انصاری، اسلام کا نظام حکومت، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۵۷

۴۲۔ محمد غانم، دکتور، مبادی القانون الدولی، مطبعۃ النحضۃ الحدیثۃ مصر، ۱۹۶۱ء، ص ۹